قسط 2

اسلام کا نظام خلافت و امارت

حافظ عطاء الرحمٰن صاحب

تسلسل کیلئے شمارہ نمبر 4 (اپریل 2003ء) ملاحظہ کیجئے۔

اسلام کا یہ طرز حکومت سابقہ و موجودہ ہمہ قسم نظام ہائے باطلہ میں انفرادیت رکھتا ہے۔ زمانہ قدیم کی شہنشاہیت، مطلق العنان شخصی طرز حکومت، مذہبی اجارہ داری (Theocaracy) قزون وسطی کی مخلوط طرز حکومت، دور جدید کی جمہوریت، اشتراکیت، لا دینیت، دھریت، ہمہ قسم نظریات حکومت اس کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔ یہ تمام نظام ہائے حکومت انسان کو انسان کا غلام بناتے ہیں۔ اور اسلام ان تمام کے خلاف جہاد کا طرز عمل اپناتا ہے۔ اور یہ اعلان کرتا ہے:

وقتلوهم حتى لاتكون فتنة ويكون الدين لله

یعنی کہ ان تمام نظام ہائے باطلہ سے مقابلہ کرو، یہاں تک کہ دین میں تمام فتن ختم ہو جائیں، اور اس روئے زمین پر اللہ احکم الحاکمین کا دین حق قائم اور غالب ہو جائے، یعنی اسلام کا نظام خلافت قائم ہو جائے۔

اس تصور کو قرآن ایک اور جگہ بڑے احسن پیرائے میں بیان کرتا ہے:

الذين ان مكنهم فى الارض اقاموا الصلوٰة واتوا الزكوٰة وامروا بالمعروف ونهو عن المنكر

مسلمان ایسے ہیں کہ اگر ہم انہیں ملک میں جما دیں، یعنی حکومت دیں تو نماز صلوٰۃ کو درستی سے پڑھائیں گے۔ اور زکوٰۃ دیں گے۔ اور اچھی بات کا حکم کریں گے، اور بری بات سے روکیں گے۔

اس پر اکتفا نہیں بلکہ قرآن کے مطالعہ یہ بات بالکل (Clear) اور عیاں ہو جاتی ہے کہ اللہ ذوالمنن نے انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد ہی نظام خلافت و امارت کی تشکیل قرار دیا ہے، سورۃ الحدید میں اس کو یوں بیان کیا گیا ہے:

لقد ارسلنا رسلنا بالبينت وانزلنا معهم الكتاب والميزان ليقوم الناس بالقسط

ہم نے تو اپنے پیغمبروں کو کھلی نشانیاں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اتاری اور میزان تاکہ وہ لوگوں پر انصاف کے ساتھ قائم رہیں۔

مذکورہ بالا آیت کریمہ سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی، کہ میزان سے مراد وہ نظام حکومت ہے جس کی بنا پر انبیاء و رسل انصاف کے ساتھ لوگوں پر حکمران رہے۔ کلمہ ''یقوم'' کا مادہ ''ق و م'' ہے۔ اور اس سے ایک اور کلمہ قوام بنتا ہے۔ قوام، حاکم اور اولی الامر یہ تینوں کلمات آپس میں مترادف ہیں، جب ہم لغوی بحث میں جائیں تو ان تینوں کلمات میں ایک لطیف سا فرق بھی موجود ہے۔ مگر مفہوم، حکمران ہونا، صاحب امر ہونا وغیرہ ہی ہے۔

صاحب مترادفات القرآن نے اس لطیف فرق کو یوں بیان کیا ہے:

۱) حاکم

وہ شخص جو لوگوں کے مقدمات کا فیصلہ کرے اور ظالم کو ظلم سے روکے۔

''واذا حكمتم بين الناس ان تحكموا بالعدل

۲) اولی الامر

کسی شخص کو کسی علاقے کا والی حاکم، بادشاہ بنانا۔

اطيعوا الله واطيعوا الرسول والى الامر منكم

۳) کھڑانا

وہ شخص جو کسی فرد، ادارے یا نظام کے معاملات کو چلانے کا ذمہ دار ہو۔

الرجال قوامون على النساء

یاایھا الذین آمنوا کونو قوامین بالقسط

قرآن نے حکمران کیلئے تین الفاظ استعمال کئے ہیں۔

ان میں قوام میں زیادہ جامعیت پائی جاتی ہے۔ تو اللہ رحمٰن و رحیم نے اپنے انبیاء کرام کیلئے جو طریق حکومت و انتظام تجویز کیا۔ وہ زیادہ جامعیت والا تھا۔ اس لئے تمام انبیاء پر بالعموم اور امت محمدیہ پر بالخصوص یہ فرض عائد ہوتا ہے۔ کہ وہ اس نظام خلافت کیلئے اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کردیں۔ یہ قربانی حاملین اسلام کا مطمع نظر اور قرآن کا ہدف وحید ہے۔

جس کی دلیل ہے:

ھو الذی ارسل رسولہ بالھدی ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ

اللہ کریم وہی ذات ہے جس نے اپنے محبوب رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ اس کو تمام ادیان پر غالب کر دے۔

اور اس قربانی کیلئے جو شخص کام آجائے وہ شہید ہے۔ اور اس کا یہی طرز عمل شہادت کہلاتا ہے اور بقول شخصے ''شہادت خلافت کی روح ہے''۔

تو معلوم ہوا کہ اسلام کے نظام حکومت کو دنیا نے بنائے ہوئے نظام ہائے حکومت پر غالب کرنا۔ یہی وہ اول و آخر مقصد وحید تھا جس کیلئے نبی مکرم ﷺ کو ہدایت اور دین کے ساتھ اس دنیا میں مبعوث فرمایا گیا۔ اور جن پاکباز نفوس نے اس مقصد کیلئے اپنی جان قربان کی۔ وہ شہید جیسے مقام عظیم اور بلند مرتبے پر فائز ہوئے اور جب تلک یہ عمل عظیم مسلمانوں میں جاری و ساری رہا۔ خلافت کا آفتاب اپنی پوری رعنائی اور تمازت کے ساتھ اس روئے زمیں پر جلوہ گر رہا۔ اور جونہی حاملین قرآن عظیم نے شہادت سے روگردانی کی حاملین نظام ہائے باطلہ چڑھ دوڑے اور آج تک امت مسلمہ اس حال میں زندگی بسر کر رہی ہے۔ کہ بساط خلافت الٹ چکی ہے اور امت اپنے منصب سے ناآشنا و نالاں قصر مذلت میں ڈوبی چلی جا رہی ہے۔ اقبال نے اس منظر کو یوں نظم کیا ہے:

آ تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر وسناں اول طاؤس و رباب آخر

عملی زندگی میں اسلام کے نظام خلافت اور باطل فرسودہ و موجودہ نظام ہائے حکومت میں کیا فرق ہے؟ کوشش کریں گے کہ اپنی بات مدلل ہو۔ اور قرآن سے استشہاد ہو۔

(۱) اسلامی نظام حکومت میں اقتدار اعلیٰ خلیفہ وقت، اس کی شوریٰ یا اور کسی ادارے کے پاس نہیں ہوتا۔ بلکہ اللہ بزرگ و برتر کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہوئے قانون شریعت کو مملکت کے قانون کی حیثیت سے رائج کیا جاتا ہے۔ مملکت کا کوئی بھی مسئلہ ہو رہنمائی کیلئے قرآن کریم موجود ہے۔ اور قرآن کی رہنمائی میں ہی خلیفہ وقت امور مملک نبٹاتا ہے۔ کیونکہ قرآن مجید کا واضح حکم ہے:

ان الحکم الا للہ

اللہ کے سوا کسی کی حکومت نہیں ہے

تو ثابت یہ ہوا کہ خلیفہ وقت کی حیثیت مقتدر اعلیٰ کی نہیں ہوتی بلکہ وہ تو ایک خادم کی حیثیت رکھتا ہے۔ سابقہ امتوں میں قیادت و راہنمائی کا فریضہ انبیاء کرام سرانجام دیتے تھے۔ مگر ان کی حیثیت بھی نائب کی سی ہوتی ہے۔ اقتدار اعلیٰ اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے۔ اور نبی اکرم ﷺ نے اس حقیقت کو یوں آشکارا کیا۔

کانت بنو اسرائیل تسوسھم الانبیاء کلما ھلک نبی خلفہ نبی وانہ لا نبی بعدی وستکون خلفاء

کہ بنی اسرائیل کی قیادت و راہنمائی انبیاء علیہم السلام فرمایا کرتے تھے۔ کہ جب ایک نبی وصال فرما جاتے تو اللہ تعالیٰ دوسرے نبی کو مبعوث فرماتے۔ لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا ہاں میرے بعد خلفاء ہوں گے۔

تو حدیث بالا سے اس بات کا وضح ثبوت مل گیا ہے۔ کہ خلیفہ کا وجود ہر دور کی اہم ضرورت ہے اور اس کے بغیر نظام خلافت کا وجود قائم نہیں رہ سکتا۔

رسول اللہ ﷺ کی زندگی اور خلفائے راشدین کے ادوار کا جب بھی ہم مطالعہ کریں تو خلافت اور اقتدار اعلیٰ کے فرق واضح ہو جاتے ہیں۔

(۲) یہ الگ بات ہے کہ خلیفہ وقت کو ان احکامات کے نفاذ کیلئے اور پوری امت میں اتحاد و یگانگت پیدا کرنے کی غرض

سے ایسے صالح باعمل اہل علم و دانش افراد کی مجلس کی ضرورت ہوتی ہے جن کے ساتھ صلاح مشورہ کیا جائے۔ لیکن یہ مجلس شوریٰ جمہوریت کی طرح قانون ساز ادارہ نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کی حیثیت صرف اور صرف اسی قدر ہے کہ آپس میں مل بیٹھ کر اس پیش آمدہ مسئلہ کا حل قرآن کی روشنی میں کیا جائے۔

آپ ﷺ نے اکثر و بیشتر تمام غزوات کے موقع پر مجلس ہائے مشاورت منعقد کیں۔ اور قرآن مجید میں بھی اس مشاورت کی طرف اشارہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

وشاورهم فی الامر

اور معاملہ میں ان سے مشورہ کرو۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اس آیت کے مصداق ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما ہیں کیونکہ یہ دونوں نبی اکرم ﷺ کے حواری اور وزیر تھے۔ آپ ﷺ اور سب مسلمانوں کے بزرگ تھے۔

مشورہ اور مجلس شوریٰ کا قیام نبی اکرم ﷺ کی سنت مطہرہ میں سے ہے مگر فیصلہ کا اختیار جمہوریت کی طرح اکثریت کو، مفاد عامہ اور مصلحت کے مطابق فیصلہ کیا جاتا ہے۔

مشورہ اور مجلس شوریٰ خلافت کا ایک رکن رکین ہے۔ مگر اس کی حیثیت و ہیئت موجودہ پارلیمنٹ سے یکسر مختلف اور سابقہ نظام کے مصاحبین کے طرز عمل سے بھی الگ تھلگ۔

اگر ہم شوریٰ کے کلمہ پر غور کریں تو علمائے لغت کے مطابق شہد کی مکھی کا رس چوسنے کا عمل شوریٰ کہلاتا ہے۔

تو اس سے معلوم یہ ہوا کہ معاشرے کے باصلاحیت افراد میں سے ان افراد کا انتخاب اس مقصد کیلئے کیا جائے جو نابغہ روزگار شخصیت ہوں کیونکہ مکھی بھی پودے کے خوبصورت ترین حصہ یعنی پھول میں سے اس کا اہم ترین حصہ رس چوستی ہے۔ تو خلافت کے وزیر و مشیر بھی ایسے ہی (Cream) ہوں تو پھر خلافت وہی منظر پیش کرے گی، جو قرآن کریم کا مطمع نظر ہے۔

(۳) انتخاب خلیفہ

خلافت و خلیفہ اور شوریٰ کے بعد سب سے اہم مرحلہ خلیفہ وقت کا انتخاب ہے انتخاب خلیفہ کیلئے اسلام جیسے پیارے دین میں کوئی لگا بندھا قانون نہیں ہے۔ بلکہ خلیفہ کون منتخب ہو؟ اس کیلئے چند ایک شرائط ہیں جو جس شخص میں موجود ہیں وہ خلیفہ بننے کی اہلیت رکھتا ہے۔

i)، خلیفہ وقت ایسا فرد ہو جس پر تمام امت متفق ہو۔ یا کم از کم امت کا غالب ترین حصہ اس کی امامت پر متفق ہو، جیسا کہ جناب صدیق و عمر عثمان رضی اللہ عنہم کی خلافت پر تمام امت متحد و متفق تھی۔ معدودے چند افراد جو جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر متفق نہ تھے۔

ii) خلیفہ ایسا شخص منتخب کیا جانا چاہئے، جس کے پاس رجال کار موجود ہوں۔ وہ اپنا حکم بزور و طاقت منوانے کی اہلیت رکھتا ہو۔

iii) خلیفہ وقت تقویٰ و بزرگی میں سب سے بڑھ کر ہو۔

iv) اسی طرح علم و وجاہت و شجاعت میں بھی خلیفہ وقت سب سے بڑھ کر ہو۔

v) خلیفہ وقت میں یہ خوبی بھی ہونی چاہئے کہ وہ حالات و واقعات کا مطالعہ و مشاہدہ کرنے کے بعد قوت فیصلہ رکھتا ہو۔

ان شرائط کا حامل جو خلیفہ منتخب کیا جائے گا اس کی اطاعت فرض ہوگی۔ اور اس کے حکم سے انحراف یا روگردانی شرعاً ناجائز ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا کہ:

ولو استعمل علیکم عبد یقود بکتاب اللہ اسمعوا واطیعوا

اگر تمہارا غلام قائد بنا دیا جائے اور وہ کتاب اللہ کے ساتھ تم پر حکمرانی کرے تو اس سے تعاون کرو۔ اور اس کی اطاعت کرو اور فرمایا کہ:

جب تک کوئی حاکم اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا حکم نہ دے تو اس کی بات سننا اور اس کی اطاعت کرنا ہر مسلمان پر لازم ہے۔ خواہ وہ بات کسی مسلمان کو پسند ہو یا ناپسند۔ اور اگر حاکم اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا حکم دے تو نہ اس کی بات سنی جائے اور نہ ہی اس کی اطاعت کی جائے۔

السمع والطاعة علی المرء المسلم فیما احب وکره مالم یومر بمعصیة فازا امر بمعصیة فلا سمع ولا طاعة

۳) من اطاع امیری فقد اطاعنی ومن عصا امیری فقد عصانی

گویا کہ میرے مقرر کردہ امیر کی فرمانبرداری درحقیقت میری اطاعت ہے۔ اور میرے مقرر کردہ نائب کی نافرمانی درحقیقت میری نافرمانی ہے۔

درج بالا تینوں احادیث سے اس بات کی واضح دلیل ملتی ہے کہ نظام کار صرف اسی صورت میں مضبوط بنیادوں پر استوار رہ سکتا ہے۔ جہاں اطاعت و فرمانبرداری عبادت کے درجہ پر ہو۔ اور یہ شرف بھی اسلام کو ہی حاصل ہے۔ کہ اس کے ماننے والے اپنے امیر، نبی اور خالق کی اطاعت صرف اسی جذبے کے تحت کرتے ہیں کہ اطاعت امیر درحقیقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔ اور امیری کی اطاعت بھی اسی طرح فرض ہے۔ مگر امیر بہرحال انسان ہے معصوم عن الخطا نہیں ہے بلکہ خطا کا پتلا ہے۔ اور اس ناطے بسا اوقات وہ ایسا حکم صادر کرسکتا ہے جس میں خالق کی نافرمانی کا عنصر غالب ہو۔ اگر امیر کوئی ایسا حکم دے تو ایسا حکم ماننا جائز نہیں۔ مگر اس بناء پر امیر کی اطاعت سے پہلوتہی کرنا بھی جائز نہیں۔ جماعت کے ساتھ رابطہ استوار رکھنا بہرصورت لازم ہے اور اس بنا پر اطاعت کا حلقہ گردن سے اتارا نہیں جاسکتا کہ امیر نے کوئی ایسا حکم دیا ہے جو کہ اللہ رب العزت کی منشا کے منافی تھا بلکہ صرف وہ حکم ہی ناقابل اطاعت ہے۔

اسی طرح ان احادیث میں ایک لطیف نکتہ اور بھی بڑے واضح طریق پر ملتا ہے۔ کہ حاکمی ومحکومی کا تعلق نسل سے نہیں بلکہ اس کا تعلق تقویٰ اور پرہیزگاری سے ہے۔

اور حکمران جو بھی مقرر ہوجائے اس کا رنگ، نسل اور خاندان نہیں بلکہ اسکا منصب اس بات متقاضی ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے اور اس کی اطاعت درحقیقت نبی ﷺ کی اطاعت ہی ہے۔ ہاں صرف ایک شرط کہ وہ (امیر) اپنی جماعت کی ہدایت و راہنمائی کا فریضہ اس شریعت کی روشنی میں سرانجام دے جو خالق لم یزل کی منشا ومرضی ہے۔

یہ اطاعت امیر کوئی وقتی یا جزوی چیز نہیں بلکہ یہ ہمہ وقتی ہے۔ اور اطاعت امیر سے انحراف پر وعید ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ فرمان نبوی ہے:

من خرج من الطاعة وفارق الجماعة فمات مات ميتة جاهلية

یعنی کہ جو مسلمان امیر کی اطاعت سے انحراف کرے اور جماعت سے الگ ہو جائے اور اسی حالت میں اگر وہ مرگیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔

معلوم ہوا کہ امیر کی اطاعت سے انحراف کا مطلب وہ زمانہ جاہلیت ہے جو قبل از اسلام تھا کیونکہ ایک مسلمان اور عام انسان میں فرق صرف اور صرف اسلام ہی تو ہے۔ اسلام انسان کو صرف اپنے تک ہی محدود نہیں رکھتا بلکہ ایک مسلمان پر اعلائے کلمۃ اللہ کی خاطر ایک منظم ومربوط اور اجتماعی و جماعتی شکل میں کوشش بھی فرض کرتا ہے۔ اور جس شخص میں یہ قابلیت وصلاحیت نہیں کہ وہ فلاح واصلاح معاشرہ کیلئے کوئی عملی قدم اٹھائے اس کا اسلام جیسے منظم و سچے دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ایسا شخص انسان کہنے کا بھی حق دار نہیں ہے۔ بلکہ قرآن حکیم کے مطابق:

اولئک کالانعام بل هم اضل

گویا کہ یہ جانور ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر ہیں۔

دور جاہلیت کے انسانوں کا نقشہ قرآن عظیم نے انہیں الفاظ میں کھینچا ہے جس کا مفہوم عرض کیا جاچکا ہے۔

حکیم اعظم وطبیب امت کے اقوال و فرمودات تاابد اس انسانیت کیلئے مشعل راہ ہیں۔ اور دین ودنیا کی کامیابی وکامرانی کی بیاد صرف انہی فرمودات پر عمل پیرا ہونے ہی میں ہے۔

مسلم قوم کی ترقی وتنزلی کا معیار جدید تعلیم، مادی ترقی، ذرائع معاش کی بہتات، دولت وثروت کی ریل پیل نہیں۔ بلکہ مسلم معاشرہ صرف اسی صورت میں ترقی کرسکتا ہے۔ اور اتنی ہی ترقی کرسکتا ہے جس قدر وہ سنت رسول اکرم ﷺ پر عمل پیرا ہوگا۔

جس قدر سنت رسول اللہ ﷺ سے اغماض وچشم پوشی آتی جائے گی۔ اسی قدر مسلم معاشرہ طوائف الملوکی اور انارکی کی طرف بڑھتا چلا جائے گا۔ بالآخر ایسا وقت بھی آئے گا کہ اللہ مالک الملک کی زمین وسیع ہونے کے باوجود حاملین قرآن مقدس کیلئے تنگی داماں کا منظر پیش کرے گی۔ اس کی واضح مثال یہ ہے کہ آج اس موجودہ کرۂ ارض پر پچاس پچپن مسلم ریاستیں ہیں جن کی کل آبادی دنیا کا ۱/۴ حصہ ہمہ قسم وسائل سے مالا مال ہے۔ جدید

ٹیکنالوجی سے لیس ہے مگر عزت کی زندگی سے محروم ہے۔ ذلت ومسکنت پوری امت مسلمہ کا مقدر بن چکی ہے۔ اس کی وجہ راقم الحروف کے خیال میں رسول اللہ ﷺ کے فرمودات سے انحراف ہے۔

قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
تو مذہب و دین کا سرچشمہ فرامین و ارشادات رسول عربی ﷺ ہی تو ہیں۔ اور جب ان پر عمل ندارد تو ترقی وعزت کا خواب کیوں شرمندہ تعبیر ہوسکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے تو ایک امیر کے ہوتے ہوئے دوسرے امیر کے وجود کو گوارا نہ کیا۔ اور اس کے قتل کا فرمان صادر فرمایا۔ اور آج پچپن اسلامی ریاستیں اور ان کے اسی تعداد کے حکمران اتنی دیدہ دلیری سے نبی مکرم ﷺ کے فرامین سے انحراف اور صرف نظر کریں تو پھر عزت وآبرو کی امید کسی مافوق الفطرت کا فاطر العقل انسان کا خواب پریشان تو ہوسکتا ہے۔ کسی عقل سلیم رکھنے والے فرد کی سوچ کا محور نہیں ہوسکتا۔

محمد عربی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

من اتاکم وامرکم جمیع علی رجل واحد یرید ان یشق عصاکم او یفرق جماعتکم فاقتلوہ

جب تم ایک شخص کی امارت پر جمع ہو جاؤ اور پھر تمہارے پاس ایک شخص آئے جو تمہاری قوت کو توڑنا چاہے اور تمہارے مابین پھوٹ ڈالنا چاہتا ہو تو اسے قتل کر ڈالو۔

اسی طرح ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارے بہترین حکمران وہ ہیں جن کی محبت تمہارے دلوں میں ہو اور ان کے دلوں میں تمہاری محبت ہو۔ تمہاری زبانوں سے ان کے لئے رحمت کی دعا نکلے۔ اور ان کی زبانوں سے تمہارے لئے رحمت کی دعا نکلے۔

اور بدترین حکمران وہ ہیں کہ تمہارے دلوں میں ان کی دشمنی ہو اور وہ تمہارے دشمن ہوں تم ان پر اور وہ تم پر لعنت بھیجیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے عرض کیا، کیا ایسے حکمرانوں سے ہم جھگڑیں؟

تو جواب میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لا، ماقاموا فیکم الصلوٰۃ، الا من ولی علیہ وال فراہ یاتی شیئا من معصیۃ اللہ فلیکرہ مایاتی من معصیۃ اللہ ولا ینزعن یدا من طاعتہ

کہ ان سے جھگڑیں نہیں اور جب تک وہ نماز ادا کرتے رہیں تم ان کی اطاعت کرتے رہو۔ اور ان کی جو بات گناہ کی دیکھو اسے پسند نہ کرو، مگر حاکم کی اجتماعی اطاعت سے ہاتھ نہ کھینچو۔

درج بالا حدیث مبارکہ سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اطاعت حاکم ہر صورت میں لازم وواجب ہے کسی صورت اس سے انحراف نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں اگر حکمران اقامت صلوٰۃ فرض سے پہلوتہی کریں تو اس صورت میں ان کی اطاعت سے الگ ہوا جاسکتا ہے۔

مزکورہ بالا احادیث اور اس سے قبل ذکر کردہ آیات، ائمہ دین کے اقوال کی روشنی میں اولی الامر، والی، امیر اور خلیفہ کے چاروں کلمات اس جانشین حقیقی کیلئے وارد ہوئے ہیں جو صحیح معنوں میں رسول اللہ ﷺ کا جانشین ہو۔ اس کی اطاعت کا وجوبی حکم دیا گیا ہے۔ یہ صرف وجوب کی حد تک ہی نہیں بلکہ فرض ہے۔ اس سے انحراف کسی صورت میں نہیں ہو سکتا۔ انحراف کی صورت میں جاہلیت کی وعید موجود ہے۔

قرآن مجید میں کلمہ ''امت'' اور احادیث میں ''جماعت'' ہر دو جگہ مقصود اجتماعیت ہے کہ کلمہ گو مسلمان خواہ جماعت کہلائیں اور خواہ امت ان میں اتحاد و یگانگت ہونی چاہئے۔ بلکہ قران مجید میں اتحاد امت پر سورہ آل عمران کا مکمل ایک رکوع موجود ہے۔ جس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

بہرحال قصہ مختصر اسلام عملی زندگی میں صرف دو چیزوں سے عبارت ہے۔ ۱) اطاعت امیر۔ ۲) اتحاد امت۔ یہ ایسا تصور حکومت تھا جو دور نبوی میں موجود تھا۔ خیر القرون کے مسلمان اس کی اہمیت سے آشنا تھے اس لئے مسلمانوں نے نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد تجہیز وتکفین کو تو موخر کیا مگر اپنے دینی و دنیوی تحفظ و انصرام کیلئے اور وحدت امت کیلئے خلیفہ کا انتخاب پہلے کیا۔ اس وقت سے مسلمانوں میں نظام خلافت و امارت کی داغ بیل پڑی۔ خلافت وہ نظام جو رائج ہوا۔ اور امارت وہ طریق کار جس پر اس نظام کو چلایا گیا۔ خلیفہ وقت کو جماعتی اور ملی زندگی میں ایک مرکزی مام حاصل ہوتا ہے۔ تمام امت اس مرکز کے گرد محیط کی صورت میں ہوتی ہے۔ اور امت امام وقت کی دعوت پر لبیک کہتے

ہوئے جان ومال قربان کواپنا فرض اولین سمجھتی ہی نہیں بلکہ دارین کی سب سے بڑی سعادت جانتی ہے۔ اور اس فعل امت پر قرآن حکیم یوں گواہی دیتا ہے۔

الذین امنوا وھاجروا وجھدوا فی سبیل اللہ باموالھم وانفسھم اعظم درجۃ عند اللہ واولئک ھم الفائزون

جولوگ ایمان لائے انہوں نے ہجرت کی اللہ کریم کے رستے میں اپنے مال اور جان کے ساتھ جہاد کیا ان کا درجہ اللہ عزوجل کے نزدیک بہت بڑا ہے۔ اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔

اور یہ ایسا فرض ہے کہ امت کا کوئی فرد اس کے بغیر جاہلیت کی ظلمت سے نکل کر اسلامی روشنی میں نہیں آ سکتا۔ جب تک یہ قیادت کتاب وسنت کے مطابق چلے۔ اس کی اطاعت ہر عاقل بالغ مسلمان پر فرض ہے۔

حالات وقرائن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خلافت دراصل آپ ﷺ کے وصال کے بعد دین کے اجتماعی مقاصد اور امت کے نظم کو قیامت تک کیلئے جاری و ساری رکھنے کیلئے ایک عمل مسلسل کا نام ہے اس بنا پر آپ کے وصال کے بعد فورا خلافت کا قیام عمل میں لایا گیا اور خلافت نے امت مسلمہ کی سیاسی، معاشرتی نبوی تنظیم کو قائم رکھا۔ ضرورت کے تحت اصلاح ترتیب کیلئے نئے ادارے قائم کئے۔ تاہم بنا بریں مدت مدید خلافت کے اندر ضعف پیدا ہوتا چلا گیا۔ مگر باوجود ضعف و کمزوری کے یہی نظام خلافت صدیوں تک اللہ کی اسی زمین پر سایہ فگن رہا۔ اور امت مسلمہ کے جملہ مفادات کے تحفظ کا ضامن یہی ادارہ ہے۔ اور ایسی قیادت کی عدم موجودگی مسلمانوں کی ملی اور قومی موت ہے۔

اس بنا پر فقہا نے خلافت کا قیام امت مسلمہ پر فرض اور واجب قرار دیا ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر بلاد اسلامیہ کے حدود بہت وسیع وعریض ہوں تو کیا اس صورت میں دو امیر منتخب ہو سکتے ہیں؟

اسکا جواب ''نہیں'' ہی ہو سکتا ہے۔ ہاں میں نہیں۔ مگر عملی طور پر خلافت عباسیہ ادھر براعظم ایشیا اور افریقہ پر قائم تھی۔ مگر ادھر بلاد اندلس جو کہ ان دنوں ہسپانیہ کہلاتا تھا وہاں اموی خاندان کے چشم و چراغ یکے بعد دیگر بطور خلیفہ حکمران بنتے رہے۔

امت نے اس عمل کو قبول عام بخشا۔ تو معلوم ہوا کہ بہت زیادہ دوری کی بنا پر ایک وقت میں دو خلفاء ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ انکا آپس میں ٹکراؤ نہ ہو۔

مگر یہ فعل رسول اللہ ﷺ کے ارشادات وفرمودات اور آیات قرآنیہ کی روشنی میں محبوب ومقبول نہیں ہے۔ جیسا کہ امام نووی شرح مسلم میں فرماتے ہیں:

اتفق العلماء علی انہ لا یجوز ان یعقد لخلیفتین فی عصر واحد سواء اتسعت دار السلام ام لا

کہ تمام علمائے امت کا اس امر پر اتفاق ہے کہ دارالسلام جتنا بھی وسیع ہو ایک زمانے میں مسلمانوں کے دو خلیفہ نہیں ہو سکتے۔

اس ضمن میں امام صاحب بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ جو علاقہ دارالسلام سے بہت دور ہو وہاں کوئی دوسرا قائد منتخب کیا جا سکتا ہے۔ یا نہیں؟

امام صاحب نہایت پرزور انداز مین فرماتے ہیں کہ تمام متقدمین ومتاخرین ائمہ کرام متفق ہیں کہ دور دراز کے مسلمانوں کو دوسرا امام یا خلیفہ مقرر کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ کے ظاہر فرمان کا یہی تقاضا ہے۔

امت کے اجتماعی مصالح کی حکمت کا تقاضا یہی ہے۔ کہ دور دراز کے علاقہ کے حکمران اپنے آپ کو خلافت کے زیر نگرانی رکھیں۔ اور اگر بوجہ دوری ان علاقوں کے نظام میں کچھ مشکلات حائل ہوں تو ان کے حل کیلئے خلافت سے رجوع کریں۔ اور باہمی رضا مندی سے اپنے معاملات طے کریں۔ تاکہ نہ تو ان کیلئے کوئی مشکل پیدا ہو اور نہ ہی امت کا باہمی ربط ٹوٹے۔ اس سلسلہ میں دونوں طرف سے نرم روی اور رواداری کی ضرورت ہے۔ اور اگر خلافت اسلام کے لافانی اصولوں کے مطابق چل رہی ہو تو اس قسم کے مسائل کے حل کیلئے ہی مجلس شوریٰ موجود ہے۔ اور شوریٰ نے خلافت راشدہ میں بڑے بڑے کٹھن مرحل پر اپنا فرض منصبی کما حقہ ادا کیا ہے۔

برصغیر کے حکمران بھی ان خلفاء سے اپنی فرمانروائی کی تصدیق کراتے تھے۔ دہلی کے حکمران منگولوں کے حملہ وغلبہ کے ۳۰ سال بعد تک بھی اپنے سکوں پر خلیفہ بغداد کا نام لکھتے رہے۔

مسلمانوں کے دلوں میں خلافت اور خلفاء کا جو احترام و تقدس تھا، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ زوال بغداد کے بعد خلیفہ مستنصر باللہ کا چچا ۱۲۶۱ء میں قاہرہ پہنچا تو سلاطین مصر نے اس کو بڑے تزک و احتشام سے خلیفہ بنا دیا اور بعد ازاں مصر میں عباسیوں کی خلافت پورے اڑھائی سو برس تک جاری رہی۔

اس کی وجہ صرف اور صرف یہ تھی کہ مسلمان خصوصا اس دور کے مسلمان خلافت کی ضرورت و اہمیت کو سمجھتے تھے اور انہیں اس بات کا بھی علم تھا کہ خلافت ہی وہ شجر سایہ دار ہے۔ جو خود دھوپ میں جل کر بنی نوع انسان کو اپنے سایہ عاطفت میں جگہ دے سکتا ہے۔ موجودہ دور میں عرصہ ہوا یہ نظام اس کرہ ارض سے مفقود ہے۔ اس کا احیاء کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ سابقہ اوراق میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کے حاصل کلام کے طور پر چند باتیں پیش خدمت ہیں تا کہ سابقہ بیان کا اعادہ ہو جائے اور آئندہ کیلئے لائحہ عمل بنانے میں آسانی ہو۔

۱) تمام انبیاء و رسل کی جدوجہد کا بالانجام ہدف اس دنیا میں اقامت دین رہا ہے۔ ایسے نظام کو مختلف اصطلاحات مثلا دینی حکومت، فطری نظام حیات، اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا انسانوں کیلئے نظام حیات، قرآنی نظام ربوبیت (پرویز کا قرآنی نظام ربوبیت مراد نہیں) امامت مومنین، امارت عظمی، ریاست عامہ، کفالت عامہ، فلاحی مملکت، حقیقی جمہوریت ریاست وغیرہ سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔

۲) نظام فطرت یعنی ایسا نظام جس میں اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے قوانین جاری و ساری ہوں، مقصود فطرت ہے۔ اسلامی حکومت کی غایت ثواب الدنیا ہے۔ یعنی وہ فطری حالت جس پر انسان پیدا ہوا تھا۔ تفسیر ابن کثیر میں ہے۔ کہ ملت ابراہیم پر جم جاؤ، جس دین کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے مقرر کر دیا ہے اور جسے اے نبی ﷺ آپ کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ نے کمال پر پہنچایا ہے۔ رب تعالیٰ کی فطرت سلیمہ پر وہی قائم ہے جو اس دین اسلام کا پابند ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جناب معاذ رضی اللہ عنہ سے اس آیت کا مطلب پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ تین چیزیں ہیں اور یہی نجات کی جڑ ہیں۔

i) اخلاص، جو فطرت ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا ہے۔

ii) نماز جو اصل دین ہے۔

iii) اطاعت، جو عصمت اور بچاؤ ہے۔

معلوم ہوا کہ اطاعت اللہ اور رسول اور وقت کے حکمران کی انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ اور حکمران وقت کی اطاعت کا طریق صرف اس نظام میں مستور و پوشیدہ ہے۔

۳) ایسا فطری نظام دنیا کے جس حصے میں بھی بالفعل موجود ہوگا وہ حصہ ان برکات و سعادت سے مستفید ہوگا۔ جو اس نظام کا لازمی نتیجہ ہیں۔

۴) پوری اسلامی دنیا کا خواہ اس کا دائرہ عمل پوری روئے زمین پر پھیل جائے ایک ہی سربراہ ہوگا جو مختلف القابات بمثل خلیفہ، خلیفۃ المسلمین، امیر المومنین وغیرہ سے یاد کیا جائے گا۔

۵) اسلامی مملکت ناقابل تقسیم وحدانی حکومت ہوتی ہے۔ جس کے انتظامی صوبے اور یونٹ تو ان گنت ہو سکتے ہیں۔ مگر خود مختار ممالک ہونا بعید از قیاس ہے۔

۶) ایک خلیفہ یا امیر المومنین کی موجودگی اور زندگی میں کسی دوسرے خلیفہ یا ولی عہد کی بیعت نہیں ہو سکتی۔ ولی عہد کی رسم سے اہل الاسلام والارض کو ایک شخص کی خواہش کی بھینٹ نہیں چڑھایا جا سکتا۔ احادیث مبارکہ کی روشنی میں یہ مسئلہ بالکل واضح ہے کہ ایک امیر کی سمع و طاعت میں کسی دوسرے فرد کی ذرہ بھر بھی مداخلت نہ ہو۔

۷) رحلت کرنے والے خلیفہ کے ایام سوگ جو کہ صرف تین دن ہیں۔ انہیں میں خلیفہ کا انتخاب ہو جانا چاہئے۔ خلافت راشدہ نے ہمیں یہی اصول دیا ہے۔

۸) خلافت یا کسی اور عہدے کیلئے کوئی شخص اپنے آپ کو بطور امیدوار پیش نہیں کر سکتا اس طرح جوڑ توڑ کی سیاست جنم نہیں لے گی۔ اسلام میں اقتدار سے رائے کا حصول نہیں بلکہ مشورے سے اقتدار کا اصول کارفرما ہے۔

۹) تمکن فی الارض کی صورت میں خلافت کی حامل وہ پوری سوسائٹی ہوتی ہے جو صالحین پر مشتمل ہو۔ البتہ ایسے معاشرہ کا فرض ہے کہ وہ اپنے میں سے ایسے شخص کو خلیفہ چنے جو اصلح یعنی وقت کے اس موڑ پر سب سے زیادہ اہل ہو۔ اہلیت کیلئے قرآن کریم تقویٰ، صلاح، علم اور جسم جیسی خوبیوں کو لازمی قرار دیتا ہے۔ اور ہر ایرے غیرے، اور ساجھے

ماجھے کو خلافت کے عالی مرتبت مقام پر متمکن نہیں کیا جا سکتا۔

۱۰) خلیفہ کا چناؤ ایک فرد ایک ووٹ کی بنیاد پر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس طرح قرآنی معیار اہلیت کی شرط پوری نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ دنیا میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جو دین کے تقاضوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ اس طرح خافت کی حقیقی روح گھائل ہوگی اور معاشرہ حقیقی معنوں میں فلاحی، اسلامی ریاست کا منظر پیش نہیں کر سکتا۔

۱۱) انتخاب خلیفہ سواد اعظم کے رحم وکرم پر بھی نہیں چھوڑا جا سکتا۔ خلیفہ کا چناؤ صرف اور صرف ارباب حل وعقد ہی کا حق ہے کہ وہ اسلامی مملکت کی معروف شخصیات میں سے احسن ترین کو منتخب کر سکتے ہیں۔ ہاں زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ ایسے محدود نیابتی طریقے میں اجماع امت کے آثار ضرور ہوتے ہیں۔

۱۲) خلیفہ وقت کا امامت کبریٰ، اور امامت صغری ہر دو صفات سے متصف ہونا ضروری ہے۔ یعنی کہ دین وسیاست میں اتحاد ہونا ضروری ہے۔ دوسرے الفاظ میں مذہبی، دینی اور سیاسی قیادت صرف ایک شخصیت ہی میں مجتمع ہو گی، اس طرح نچلی سطح پر موجود عامل وحکمران بھی انہی خصوصیات کا حامل ہونا چاہئے خلیفہ وقت بیک وقت سپریم کمانڈر، قاضی القضاۃ، امیر المومنین، امام الصلوٰۃ کی حیثیت رکھتا ہے۔

۱۳) امور مملکت قران وسنت اور شوریٰ کی شمولیت سے سرانجام پاتے ہیں۔ مگر یہ تمام اجزاء قانون سازی کا حق نہیں رکھتے۔ قانون سازی کا حق صرف اس ذات کبریا ہی کو ہے۔ جو اس کائنات کا بلاشرکت غیرے تنہا خالق ومالک ہے۔ بقول علامہ اقبال۔

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمران ہے اک وہی باقی بتا آزری

اختلاف رائے تو ہو سکتا ہے اور اس صورت میں کوئی بھی فیصلہ کثرت رائے سے نہیں بلکہ موقع ومحل کی مناسبت سے دلیل کے وزن کی حیثیت میں ہوتا ہے۔ خلیفہ وقت کو ویٹو کا حق حاصل نہیں۔ وہ صرف انتظامی اہلیت رکھتا ہے۔ اور شوریٰ قرآن وسنت کے اجمالی قواعد کی تشریح کی مجاز ہے۔

۱۴) اسلام کے نظام حکومت اور معاصر نظام ہائے حکومت میں ایک بنیادی فرق ہے۔ اور وہ یہ کہ اسلام میں حزب اقتدار وحزب اختلاف کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ بلکہ اہل تمکن تو حزب اقتدار ہوتے ہیں۔ اور پوری امت حزب اختلاف کا کردار ادا کرتی ہے۔

۱۵) اسلامی نظام حیات میں معروف گروہ بندی، پارٹی بازی، سیاسی جماعتوں کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ تمام امت ایک وحدت ہوتی ہے۔ اور تمام امت کا مقصود ومدعا اعانتِ خلافت ہوتا ہے۔ تاکہ خلافت بطریق احسن اپنے فرائض سرانجام دے سکے۔

خلیفہ وقت مخصوص ارکان شوریٰ کے علاوہ دیگر شعبہ ہائے زندگی کے ماہرین علماء وغیرہ کی رائے سے مستفید ہو سکتا ہے۔ مگر اس ضمن میں حلیفانہ روح کارفرما ہوگی۔ حریفانہ جذبات نہیں ہونگے۔ اور نہ ہی ذاتی مفاد اور خود غرضی یا کوئی مصلحت شامل حال ہوگی۔

۱۶) اسلامی نظام حکومت میں مجرد حکومت یا اقتدار مقصود نہیں بلکہ خلافت کا مقصود احکام شرعیہ کا نفاذ ہے۔

۱۷) خلافت کے قیام کیلئے کوشش فرض کفایہ ہے۔ اور خلافت کے بغیر مسلمانوں کی زندگی ایک گنہگار کی زندگی ہے۔ کیونکہ اقامت دین کا فرض خلیفہ کے بغیر سرانجام نہیں دیا جا سکتا۔

۱۸) صحابہ رضی اللہ عنہم نے اقامت خلافت پر جس زوردار طریق پر اجماع اختیار کیا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے نبی اکرم ﷺ کی تجہیز وتکفین کی نسبت انتخاب خلیفہ کو فوقیت دی۔ اور نبی ﷺ کی تجہیز وتکفین سے قبل جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلافت نبی اکرم ﷺ کی وفات حسرت آیات کے بعد منصۂ شہود پر آئی۔ اس سلسلہ خلافت کو زمان وقت کے لحاظ سے درج ذیل ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ خلافت راشدہ

اس سلسلہ خلافت کے پہلے خلیفہ جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ سب سے قلیل العمر خلافت ہے۔ اس کا باقاعدہ آغاز ۱۱ ہجری ۶۳۳ء میں ہوا۔ یہ ایک ایسی خلافت ہے۔ جو آئندہ کیلئے مشعل راہ اور نمونہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ خلافت علی منہاج النبوۃ قائم تھی۔ اور فقہاء کے نزدیک اس کو خلافت خاصہ کہا جاتا ہے۔ اس خلافت کا اختتام ۴۰ ہجری ۶۶۱ء میں ہوا۔ اور اس سنہری دور کے آخری خلیفہ جناب علی رضی اللہ عنہ

ہیں۔

۲۔ خلافت بنو امیہ

یہ دوسرا دور خلافت ہے۔ اس کا باقاعدہ آغاز دمشق میں ہوا۔ اس سلسلہ خلافت کے پہلے خلیفہ جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ تھے۔ اس دور کی ابتداء ۴۱ ہجری ۶۶۱ء میں ہوئی۔ اور ان کا پایہ تخت دمشق ہی تھا۔

اس دور خلافت میں خلافت راشدہ کی حقیقی روح تو کارفرما نہ تھی۔ اور کچھ عجمی شاہان کی خرابیاں تو پیدا ہوگئی تھیں۔ مگر اس کے باوجود یہ دور بھی اسلام کا ایک سنہری دور ہی کہلاتا ہے۔

جہاد وقتال ہوتا رہا اور نظام ہائے باطلہ کی بیخ کنی ہوتی رہی۔ اور اسلام کا پیغام برصغیر، افریقہ اور سپین تک کے دور دراز علاقوں میں پہنچا۔ اس خلافت کا اختتام ۱۳۲ ہجری ۷۵۰ء میں ہوا۔

۳۔ سلسلہ خلافت کا تیسرا دور

خلافت عباسیہ کے نام سے موسوم ہے۔ اس کی ابتداء ۱۳۲ ہجری ۷۵۰ء میں ہوئی اور اختتام ۶۵۶ ہجری ۱۲۵۸ء میں ہوا۔ بنو عباس کی خلافت سے مراد جناب عباس رضی اللہ عنہ عم رسول ﷺ کے خاندان کی خلافت ہے۔ یہ لوگ بنو امیہ سے اقتدار چھین کر سریر آرائے اقتدار ہوئے تھے۔ اور بنو عباس نے حصول اقتدار کیلئے ایرانی نو مسلموں سے تعاون و مدد حاصل کی تھی۔ ان لوگوں کا یہ دعویٰ تھا کہ ایک خالص اسلامی حکومت ہے۔ اور انہوں نے عرب اور غیر عرب کے امتیاز کو ختم کیا۔ جس کا انجام عرب وعجم کے اختلاف کی صورت میں نمودار ہوا۔

سابقہ دور اور موجودہ دور کسی حد تک موروثی شہنشاہیت کے اصول پر قائم تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ جہاد اور حقیقی اسلامی حکومت کے جذبات بھی کارفرما تھے۔ اور امت مسلمہ ایک مرکز پر متحد تھی۔

ہاں بنو امیہ کے زوال کے بعد ایک اموی نوجوان عبدالرحمٰن الاول نے اندلس میں اموی خلافت الگ قائم کی تھی مگر معروف خلافت کے تذکرہ کے وقت صرف خلافت عباسیہ کا ہی ذکر کیا جاتا ہے۔ اس لئے اس کا تذکرہ موقوف کیا جاتا ہے۔

اس سلسلہ خلافت کا پہلا خلیفہ سفاح تھا اور خلیفہ واثق تک کے تمام خلفاء یگانہ روزگار اشخاص تھے۔ ان میں کچھ خامیاں تو ضرور تھیں مگر اس کے ساتھ ساتھ ان کے کارنامے بہت ہی روشن تھے۔ اور دینی اقتدار انہوں نے ہمیشہ قائم رکھا۔ خلیفہ سفاح نے اپنی بیعت کے وقت کہا تھا کہ ہم لوگوں سے کتاب وسنت کے مطابق برتاؤ کریں گے۔

بقول ڈاکٹر گستاؤلی پان خلفائے عباسیہ کے ملکی انتظام نے انہیں بہت بڑے رفاہ عام کے کام کرنے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔ پورے وسیع و عریض ملک میں سڑکیں بن گئیں اور کارواں سرائیں ومساجد، شفاخانے اور مدارس ہر طرف علی الخصوص بغداد، بصرہ اور موصول میں بکثرت قائم ہوگئے تھے۔

المختصر خلافت بنو عباس اسلام کا وہ سنہری دور ہے جس میں ہر طرح کی ترقی ہوئی اور خلیفہ بغداد کا طوطی اس سرزمین پر بولتا تھا۔

بالآخر اس میں کچھ ضعف کے آثار نمایاں ہونا شروع ہوئے۔ اس ضعف کی ابتداء خلیفہ معتصم ۲۳۲ ہجری کے دور سے شروع ہوئی۔ اس کا انجام ۶۵۶ ہجری میں سقوط بغداد کی صورت میں ہوا۔ مگر اس واقعہ فاجعہ کے بعد خلیفہ مستنصر کے چچا احمد بن طاہر عباسی مصر بحفاظت پہنچ گیا تو سلاطین مصر نے اس کی بیعت کی۔ اور اس کے بعد تقریباً ڈھائی سو برس عباسی خلافت جو کہ برائے نام تھی مصر میں قائم رہی۔

آخر کار عباسی خلیفہ متوکل نے ترکی کے سلطان سلیم خان اول کے ہاتھ پر بیعت کر کے ۹۲۳ھ میں خلافت کے تمام حقوق و امتیازات سلطنت عثمانیہ کے سپرد کر دیئے۔

یہیں سے آخری سلسلہ خلافت کا آغاز ہوا۔ جو تاریخ میں خلافت عثمانیہ کے نام سے موسوم ہے۔ خلافت عثمانیہ کی ابتداء تو اس سے قبل ۲۹۹ ہجری ۱۲۹۹ء میں ہی ہو چکی تھی اور اس سے قبل تقریباً تینتالیس سال ایسے تھے کہ خلافت برائے نام تھی اس میں سے بھی چار سال کا عرصہ ایسا ہے۔ جس وقت روئے زمین پر خلیفہ کے وجود کا کوئی نام ونشان نہ تھا۔

خلافت عثمانیہ کی ترک قبائل غز کے چشم و چراغ امیر عثمان نے ۲۹۹ ہجری ۱۲۹۹ء میں بنیاد رکھی۔ اور اس کی اولاد میں ۱۳۴۲ ہجری ۱۹۲۳ء تک سینتیس خلفاء آئے۔

ابتداء میں عثمانیوں نے سلجوقیوں کی اجازت سے مشرقی روم کے اہم شہر سگوت کو مرکز بنا کر اپنا کام شروع کیا۔ اور ۷۵۷ ہجری میں اس خاندان کے سلطان محمد ثانی فاتح نے قسطنطنیہ کو فتح کر کے مشرقی روم کی سلطنت ختم کی اور پھر اسی شہر کو اپنا دار الخلافہ قرار دیا۔ اور مزید علاقے اس

سلطنت کا حصہ بنے۔ بعدازاں سلیم اول نے ۹۲۳ ہجری ۱۵۱۷ء میں کردستان، مصر، شام عرب علاقے اپنی مملکت میں شامل کئے۔ اور خلیفہ متوکل سے اعزازات و امتیازات و حقوق حاصل کرنے کے بعد امیر المومنین اور خلیفۃ المسلمین کا لقب اختیار کیا۔ یہ پہلا حکمران ہے جس نے اس خاندان میں سب سے پہلے خلیفہ کا لقب اختیار کیا۔

یہ حکومت وسعت میں اپنے دور کی ایک بڑی بلکہ سب سے بڑی ریاست تھی۔ اس خاندان میں سلیمان اعظم جیسا لائق حکمران بھی تھا۔ جس نے رومیوں کے بحری بیڑے کو شکست فاش دی اور یہ وسیع سلطنت ہنگری سے مصر تک اور ساحل فرات سے جبرالٹر تک پھیلی ہوئی تھی۔

یہ خلافت بھی سابقہ دو خلافتوں کے مماثل تھی۔ عثمانی خلفاء نے بھی سادگی، علم دین، احکام اسلام کے اجراء و نفاذ کو اپنا شعار بنائے رکھا۔ جہاد جو کہ خلافت کی روح ہے اور اسلام کی چھت ہے، بڑھ چڑھ کر اس میں حصہ لیا۔

رواداری اس خلافت کا طرہ امتیاز تھا، غیر مذہب رعایا سے حسن سلوک کے متعلق پروفیسر آرنلڈ کا بیان قابل غور ہے۔ کہ مسلمانوں نے رومیوں کو ایسا تحفظ، امن وسکون اور مذہبی آزادی عطا کر رکھی تھی کہ عیسائیت نے خلافت عثمانیہ کو اپنی کلیسائی حکومت پر ترجیح دیتے ہوئے اسے اپنا نجات دہندہ قرار دیا۔

انجام کار اس کارگاہ زیست کی ہر چیز کو فنا ہے۔ بقاء و دوام صرف مالک الملک ہی کو حاصل ہے۔ رفتہ رفتہ خلافت عثمانیہ میں کچھ کمزوریاں عود کر آئیں ویسے بھی دستور دنیا ہے:

لکل شئی اذا ماتم نقصان
فلا یفر بطیب العیش انسان

کہ ہر عروج را زوال کے مصداق شہرت و طاقت کی بلندی سے ہی نقطہ تنزل شروع ہوتا ہے۔ آخر یہ کمزوری بڑھتی گئی اور پہلی جنگ عظیم میں غیروں نے سازش کے تانے بانے بن کر ۱۹۲۳ء میں اس خلافت کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دیا۔ اور ۱۹۲۳ء سے ہنوز مسلمانوں کے مصائب و آلام میں آئے دن اضافہ ہی ہوا جا رہا ہے۔ محرومی ناکامی، زلت و رسوائی اس امت کا مقدر بن چکی ہے اور یہ یاس و ہراس اس قوم کا مقدر نہیں ہو سکتا جس کو قرآن حکیم ''انتم الاعلون ان کنتم مومنین'' کہے۔

کہ تم ہی برتر ہو بشرطیکہ تم مسلمان ہو مومن ہو۔

خلافت کا یہ منصب جلیلہ گو اس کو تباہ و برباد کرنے میں تمام غیر مذاہب شامل تھے مگر کاری ضرب لگانے والا شخص مصطفیٰ کمال المعروف اتاترک تھا جو کہ یورپ کا پروردہ تھا۔ اور اسنے اپنے ان غیر ملکی آقاؤں کو خوش کرنے کیلئے ترکی کی کامیابیوں کو ناکامیوں میں اتحادیوں کی خواہش کے مطابق بدلا اور ۳۱، اکتوبر ۱۹۲۳ء کو آخری خلیفہ المسلمین عبدالحمید کو معزول کر کے جمہوریہ ترکی کے نام سے لادینی نظام کے تحت ایک لادینی مملکت قائم کر دی۔

۱۹۲۳ء سے ہنوز امت مسلمہ اپنے اس سپر سے محروم ہے۔ اور قبلہ اول پنجہ یہود میں سسک اور تڑپ رہا ہے۔ ان لوگوں کی نظریں اب حرمین شریفین پر لگی ہوئی ہیں۔ ہر طرف خون مسلم سے ہولی کھلی جا رہی ہے۔ عصمت مسلم چور چور ہے اسلام کی شان اور آن بان قصہ پارینہ ہو چکی ہے۔

یہ سب کچھ بدل سکتا ہے بشرطیکہ ''احیائے خلافت'' ہو جائے۔ احیاء کا طریق کار کیا ہوگا اس کیلئے ہوم ورک کیسے کرنا ہوگا یہ سوالات اور ان کے جوابات دوسری محفل کیلئے اٹھا رکھتے ہیں۔

بقیہ : امت مسلمہ پر آفت اور اس کی بے حسی

عذاب کا کوڑا لگایا جا رہا ہے۔ لیکن مدہوش قوم غیرت اور عقل کے ناخن لے۔ کالے قانون جس کی زد میں ڈھیروں مسلمان آ چکے ہیں اس کو ترک کر دیں، بے حیائی، یورپین میڈیا کی مثل آزادی، حرام امور کا کھلے عام ارتکاب، اسلامی تعلیمات پر مذاق اور کفار سے محبت ان تمام اعمال سیئہ کے سنگین جال سے نکل جائیں ورنہ اللہ کا عذاب جو کہ ایسی اقوام پر ترس نہیں کھاتا، نازل ہو سکتا ہے۔ اپنے ضمیروں کو جھنجھوڑیئے اپنی آخرت کی فکر کیجیئے اور اللہ کے سامنے جواب دینے کا تصور ذہنوں میں لائیے تاکہ ان آفتوں اور عذابوں کے نزول کے باعث تم پر چھائی ہوئی بے حسی و مدہوشی رفع ہو جائے۔ جو اپنے نفس کی فلاح چاہتا ہے وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات کو سینے سے لگائے اور یہود و نصاریٰ جن کا پروگرام اسلام کو مٹانا ہے ان کو اپنے پاؤں کی ٹھوکر سے دور کریں تب کامیابی و کامرانی ممکن ہے۔ ورنہ اللہ کی پکڑ بہت ہی سخت ہے جو اس میں آ جاتا ہے وہ نکل نہیں سکتا۔ اللہ ہمیں اپنے عذابوں سے محفوظ رکھے اور امت مسلمہ کی بے حسی کو دور کرے اور مستقبل میں سنبھلنے کی توفیق دے آمین۔

وما توفیقی الا باللہ